Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 38, Sr.No.107, 2017 pp 123 - 142

مجلۂ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۸، اپریل۔جون ۲۰۱۷ء، شمارہ ۱۰۷

بیگانگی کی سماجیاتی تاریخ

☆ڈاکٹر محمد اکرم سرا

Abstract:

Human biengs used to live together in the beginning and feel for one another. By and by, classes emerged in society and alienation got its roots among humans. As the gulf between the classes widened, alienation kept on increasing in society. There are three large forms of society in history. The first one is that of the master and the slave; the second one is that of the landlord and the serf; the third one is that of the capitalist and the labourer. The third form is the most dangerous one as the labourer has been made a machine by depriving him benefitting of his personal skill. A common man falls victim to sense of deprivation on account of the private property of capitalists. Capitalism is based on greed and lust as it gives rise to class distinction which leads to large scale alienation in society.

Key words: Alienation, Classes, The master and the slave, Capitalists, Deprivation, Greed and Lust, Class distinction,

ہر نئی تحقیق کے بطن سے ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔اس لیے دنیا عجیب بھی ہے، دلچسپ بھی اور حیرت انگیز بھی۔ یہ دنیا کب اور کیسے وجود میں آئی ؟ اس کا حتمی جواب ممکن نہیں لیکن ماہرینِ ارضیات نے جو کھوج کاریاں کی ہیں ان کے مطابق "دنیا 470 کروڑ سال پہلے وجود میں آئی"(۱) سائنسی نقطہء نظر کے مطابق دنیا ابتدا میں گرم گیسوں اور غبار کا مجموعہ تھی جسے ٹھنڈا ہونے میں کئی لاکھ سال لگے" اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جب دنیا میں ساٹھ ہزار سال متواتر بارش ہوتی رہی۔"(۲) آخرِ کار دنیا رہنے کے قابل ہوگئی۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، شیخوپورہ

قرنوں کے بجھتے انگار اک موجِ ہوا کا دم
صدیوں کے ماتھے کا پسینہ پتیوں پر شبنم
دورِ زماں کے لاکھوں موڑ اک شاخِ حسیں کا خم(۳)

زمین جب معتدل درجہ حرارت پر آ گئی تو اس پر زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "متواتر بجلی کی چمک اور فضائی بخارات نے مل کر ایسا کیمیائی ملغوبہ بنایا جو ہزاروں کروڑوں سال بعد یہاں پہلا cell تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا"(۴) چنانچہ اس لائف سیل سے یہاں پودے، جنگلات، جراثیم، کیڑے مکوڑے اور جانور پیدا ہو گئے۔ اور اس کے بعد انسان!!!

اس کرۂ ارض کی بہترین مخلوق انسان ہے۔ انسان کی تخلیق کے بارے میں ایک تو مذہبی اور آدرشی تصور ہے کہ خدا نے آدم کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا اور دنیا میں بھیج دیا۔ جبکہ تخلیقِ آدم کا مادی تصور یہ ہے کہ انسان حیوان کی ارتقائی صورت کا نام ہے۔ اس ضمن میں ڈارون نے خاصا کام کیا ہے "اس نے سائنسی بنیادوں پر ثابت کیا ہے کہ انسان حیوان کی ارتقاء یافتہ صورت ہے"(۵) ابتدائی دور کے انسان کو Homo Erectus کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے ڈھانچے کینیا سے ملے ہیں جو تقریباً پانچ لاکھ سال پہلے کے ہیں۔

ماقبل تاریخی دور کے حالات غیر منظم صورت میں ملتے ہیں۔ مارگن وہ پہلا شخص تھا جس نے ماقبل تاریخی دور میں ایک مخصوص ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی مارگن حالات کو سمجھنے کے لیے تین طرح کی درجہ بندی کرتا ہے:

1۔ عہدِ وحشت

2۔ عہدِ بربریت

3۔ عہدِ تہذیب

عہدِ وحشت میں انسان جنگلوں میں رہتا تھا اور درختوں کے پھل پتے اس کی خوراک تھے۔ بعد میں اس نے آگ کا استعمال سیکھ لیا اور جنگلی حیات کا شکار کرنے لگا جب وہ مقام اور موسم کی قید سے آزاد ہوا تو جنگلوں سے نکل کر پانیوں پر پھیل گیا اور زمین کے بڑے حصے پر پھیل گیا اور اس کی خوراک سمندری حیات ٹھہری۔ اس دور کے انسان اکٹھے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

عہدِ بربریت کی پہچان ظروف سازی، کاشت کاری، گلہ بانی اور اوزار سازی ہے۔ ان اشیا کی ایجاد سے کاشت کاری کو فروغ حاصل ہوا۔ یوں بڑی بڑی بستیاں وجود میں آ گئیں۔ ہومر کی نظموں خصوصاً ایلیڈ میں بربریت کا عہد اپنے عروج پر نظر آتا ہے جس میں لوہے کے اوزار دھونکنی، ہاتھ سے چلنے والی چکی، کمہار کا چاک، تیل اور شراب کشید کرنا، دھاتوں کو مصفا کرنا، جنگی رتھ اور فصیلوں والے شہر نظر آتے ہیں۔ سبطِ حسن اس دور کو 'ابتدائی کیمونزم' کا دور کہتے ہیں۔ یہ دور لاکھوں برس تک جاری رہا"(۶)

خاندانی نظام

تاریخ میں خاندان کی بہت ساری شکلوں کا پتہ چلتا ہے۔ابتدا میں ہم خاندانی (سگوتری) کا رواج تھا۔جس کی ابتدائی صورتیں امریکہ کے انڈینز، افریقہ اور ہندوستان کے قبائل میں مشترک نظر آتی ہیں۔ہم خاندانی نظام جزیرہ ہوائی میں بہت بعد تک موجود رہا ہے۔اس نظام میں موجود شادی کے ادارے کو فریڈرک اینگلز یوں بیان کرتا ہے:

> ''قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے جن میں مرد متعدد عورتوں سے شادی کرتے تھے اوران کی بیویاں متعدد شوہروں سے اوراس لیے ان کی اولاد سبھی کی مشترک سمجھی جاتی تھی۔ان حالات میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی۔یہاں تک کہ وہ بالکل مٹ گئے اوران کی جگہ ایک مرداورایک عورت کے بیاہ کا رواج ہوا۔''(۷)

سگوتری نظام میں جنسی تعلقات کے حوالے سے خاصی آزادیاں تھیں۔لیکن یہ صرف زندگی کا ایک رُخ تھا۔دوسرا رخ یہ ہے کہ کاشت کاری اور گلہ بانی کے باعث دولت کا ایک سوتا کھل گیا جس کے باعث نئے معروضی سماجی رشتے قائم ہونے لگے۔آریاؤں اور سامیوں کو دولتِ کثیر مل رہی تھی۔دولت آئی تو اپنے ساتھ مسائل بھی لائی۔چنانچہ اب زمینوں اور مویشیوں کے ریوڑوں اور غلامی پر ذاتی ملکیت قائم ہونے لگی۔ریوڑ جو پہلے قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہوتے تھے، اب وہ صرف سردار کی ملکیت بن گئے۔یہی حال زمینوں کا ہوا۔ریوڑوں اور زمینوں کی ذاتی ملکیت کے باعث رویوں میں تبدیلی آئی اور سماج میں طبقاتی تضاد قائم ہوگیا۔سماج کی یہ اونچ نیچ معاشرے میں عملِ بیگانگی کی خبریں دینے لگی۔سردار زمینوں اور ریوڑوں کے مالک ہوتے گئے اور عام افراد ان کے استحصال کا شکار ہونے لگے۔اس نظام کے تحت عام آدمی اب کسی چیز کا مالک نہ رہا۔اب وہ صرف اپنی قوتِ محنت کا مالک رہ گیا۔وہ حالتِ مجبوری میں اپنی قوتِ محنت جاگیردار کے ہاتھ بیچنے پر مجبور ہوگیا۔ذاتی اور خاندانی ملکیت کے باعث دوسری اجناس کی طرح انسان کی وقتِ محنت بھی خریدی جانے لگی۔دولت ہوئی تو لامحالہ وراثت کے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ابتدا میں مادری نظام رائج تھا اولاد کو ماں کی جائیداد سے ترکہ ملتا تھا بعد میں پدری نظام رائج ہوجانے کے باعث اولاد کو والد کی وراثت بھی ملنے لگی۔دولت اور جائیداد اس حد تک انسانی جڑوں میں سرایت کرگئی کہ اب رشتے ناطے بھی دولت کی بنیاد پر طے ہونے لگے۔(۸)

گن نظام (مادری نظام) کے زوال کے بعد پدری نظام رائج ہوگیا۔اس نظام میں دولت جمع کرنے کا رجحان مزید بڑھنے لگا دولت کہیں کم اور کہیں زیادہ جمع ہوتی رہی۔اس سے طبقاتی تقسیم کی خلیج مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ملکیت کے حامل طبقوں اور ملکیت سے محروم طبقوں کے درمیان مغائرت کا عمل غیر محسوس طریقے سے جاری رہا۔اس سے سماج کے دستور اور روایات پر بھی اثر پڑا۔یوں پہلی بار ''موروثی شرفاء اور

بادشاہت" کی داغ بیل پڑی۔(۹) پہلے انا کی تسکین کے لیے جنگیں ہوتی تھیں اب لوٹ مار کے لیے جنگیں ہونے لگیں۔

یوں سماج میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو ذاتی ملکیت کو تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ دولت میں تیزی سے اضافے کے لیے بھی اقدامات کرے طبقاتی تقسیم کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے اور ملکیت سے محروم طبقات کے استحصال کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے ریاست (State) قائم کر دی گئی۔(۱۰)

ریاست کی ابتدائی صورت ایتھنز میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد یونان، روم اور جرمن میں ریاستیں قائم ہوگئیں۔ان ریاستوں کے قیام کے ساتھ ہی صدیوں سے موجود گن نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

جاگیرداری نظامِ حیات

گن نظامِ حیات اور پدری نظامِ حیات کے بطن سے طبقاتی سماج کا قیام عمل میں آیا۔اس نظام کے قیام کے ساتھ سماج میں موجود خاندان کی مروجہ صورتیں ختم ہوگئیں۔اس سے سماج کی اکائی کو ضعف پہنچا اور نامیاتی طرزِ حیات کا خاتمہ ہو گیا۔ ماہرینِ معاشیات و سماجیات نے طبقاتی معاشرے کی تین صورتوں کی نشان دہی کی ہے:

1۔ آقا اور غلام
2۔ جاگیردار اور زرعی غلام
3۔ مل مالک اور اُجرتی مزدور

اس طبقاتی معاشرے میں طاقتور طبقات نے کمزور رہ جانے والے طبقات کا استحصال شروع کر دیا۔یہیں سے غلامی (Slavery) کا ادارہ قائم ہوا۔ایک غلام کی اپنی شناخت ختم ہوگئی اور وہ آقا کی ملکیت میں شامل ہو گیا۔آقا کے نزدیک اس کی حیثیت ایک 'شے' سے زیادہ نہ تھی۔قدیم رومی عہد میں ان غلاموں کو ''آواز والا اوزار'' کہتے تھے۔(۱۱)

اس آواز والے اوزار کی اپنی مرضی ختم ہو چکی تھی۔ اب اس کی حیثیت محض اپنے آقا کے لیے دولت حاصل کرنے والی ایک مشین تھی اور یہ مشینیں ایک دوسرے سے آگاہ نہیں ہوتی تھیں بس آقا کی دولت اور اس کی سلطنت کو وسیع کرنے کے لیے اشارہ ابرو کی محتاج تھیں۔غلاموں کی اس تگ و تاز کے بعد آقا ان کا پھل کھاتے اور غلام پہلے کی طرح خالی دامن رہ جاتے۔غلامی کا یہ عہد آٹھویں صدی عیسوی (طلوعِ اسلام) تک پھیلا ہوا ہے۔غلامی کے خاتمے کے بعد جاگیرداری نظام کی شکل سامنے آتی ہے۔ یورپ اور ایشیاء میں اس نظام کے تحت غلاموں کی حالت اور حیثت تبدیل ہوگئی جاگیرداری نظام تین طبقات پر مشتمل تھا: (i) امراء اور جاگیردار (ii) مذہبی پیشوا (iii) زرعی غلام

زرعی غلام عہدِ غلامی کے غلام سے مختلف حیثیت رکھتے تھے۔ یہ خاندان کی صورت میں رہتے تھے اور ایک جاگیر کے دوسرے کو منتقل ہونے کے ساتھ ہی یہ بھی نئے جاگیردار کو منتقل ہو جاتے تھے۔ ان لوگوں کا اپنی زمین کے ساتھ تعلق قائم رہتا تھا۔ جاگیردار کا ان کے ساتھ برتاؤ کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو یہ اپنے گھر میں ہی رہتے تھے اور زمین پر کام کرنے کے مجاز تھے۔ اس عہد میں 'کلیسا' کی طاقت میں بھی بدستور اضافہ ہوتا گیا۔ جاگیردار مرتے وقت جنت میں جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنی زمین کے قطعات چرچ کو وقف کر دیتے تھے۔ یوں چرچ کی زمینوں کا رقبہ روز بہ روز بڑھتا گیا۔ اور سرف (Serf) پر پادریوں کا تصرف بھی بڑھتا گیا۔ (۱۲)

جاگیرداری عہد میں تجارت کا آغاز ہوا۔ اس عہد میں صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ افریقی ممالک اور امریکہ پر قبضے ہوئے۔ افریقی باشندوں کی تجارت ہوئی۔ اس تجارت نے ایک ایسے طبقے کو پیدا کیا جس نے ہر چیز کو برائے فروخت بنا دیا اس کے قیام سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

جاگیرداری نظام کے خاتمے کی بنیاد انقلابِ فرانس (1779) بنا۔ انقلابِ فرانس تاریخ کا عظیم کارنامہ تھا جس نے سوچ کا انداز ہی بدل دیا۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں: ''انقلابِ فرانس نے قرونِ وسطیٰ کے تین استحصالی ستون ملوکیت، جاگیریت، اور کلیسائیت ڈھا دیئے تھے۔'' (۱۳)

سرمایہ دارانہ نظامِ حیات

سرمایہ دارانہ عہد تمدن کا عہد ہے۔ عہدِ بربریت میں انسان اشیا پیدا کرتا تھا۔ لیکن تمدن کے عہد میں اشیاء کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہاں سے تاجر طبقہ پیدا ہوا۔ یہ تاجر طبقہ عملاً پیدا ار میں حصے دارنہ تھا لیکن اس نے سارے نظام کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ طبقہ معمولی خدمت کے عوض زرِ کثیر کا مالک بن جاتا تھا اور سماجی اثر پیدا کرتا تھا۔ دھات کے سکے کی ایجاد نے تاجر طبقے کو اور بھی مضبوط کیا۔ اس کی مدد سے پیدا کرنے والے پر پیدا نہ کرنے والے کا تسلط قائم ہو گیا۔ سکے کی ایجاد اور زرِ کثیر کی ہوس نے سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کے ساتھ ہی بارٹر سسٹم ختم ہو گیا اور اس کی جگہ طلب و رسد کا نظام قائم ہو گیا۔

سرمایہ داروں نے تجارت کے ذریعے دنیا کی تسخیر کرنی چاہی۔ انھوں نے قدیم رسم و رواج اور تاریخی حقوق کے بدلے خرید و فروخت اور آزاد تجارتی معاہدوں کے ذریعے قدیم روایات اور انسانی مساوات کا جنازہ نکال کر ہر چیز کو جنس بنا دیا۔

تجارت کی توسیع کے ساتھ تاجر کا کردار اور اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ دستکار کو خام مال لا کر دیتا تھا اور تیار شدہ اشیا بازار میں فروخت کر دیتا تھا۔ یوں پیداوار میں اضافے کے لیے ایک ایسی تنظیم پیدا ہو گئی جس نے صنعت کے حصے کر دیئے۔ پہلے ایک شے ایک ہی جگہ پر اور ایک ہی فرد سے تیار ہوتی تھی لیکن اب ایک شخص کپاس دھنتا ہے دوسرا کاتتا ہے تیسرا بنتا ہے، چوتھا تھان کھینچتا ہے اس کے علاوہ کپڑے رنگنے

کے لیے الگ، صاف اور استری کرنے کے لیے الگ آدمی ہیں۔اس سے اگر چہ وقت کی بچت ہونے لگی اور صنعت کا پہیہ بھی تیز ہو گیا لیکن قدیم دستکاریوں اور دستکاروں کو زوال آ گیا۔اب کوئی فن کار کسی فن کا مالک نہ رہا بلکہ وہ فن کے ایک حصے پر کام کرنے والا دستکار بن گیا۔اس اندازِ تجارت سے گھریلو صنعت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ فیکٹریاں اور کارخانے کھل گئے۔

اس عہد میں سائنس کی مختلف ایجادات نے بھاری صنعتوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔یوں سرمایہ دارانہ بنیاد پر بھاری صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جانے لگا۔اس کے لیے بھاری سرمائے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے مختلف اسباب پر غور کیا جانے لگا۔جن میں جائنٹ سٹاک کمپنیوں کا قیام، محصولات کی شرح میں اضافہ کیا گیا۔نو آبادیات کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا گیا۔تجارتی نظریہ زر کے تحت نو آبادیات کے خام مال کو اپنی فیکٹریوں تک رسائی دے کر تیار شدہ اشیا برآمد کی جانے لگیں۔اس کے لیے سائنس دانوں کی سرپرستی کی گئی اور تجارتی بیڑے بنائے گئے۔نو آبادیات پر ایسے ظالمانہ قوانین نافذ کیے گئے جس سے ان کی مقامی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔مختلف قوانین کے ذریعے نو آبادیات کے باشندوں کو ایسی صنعتیں شروع کرنے سے منع کیا گیا جو انگلستان کی صنعتوں سے متصادم ہوں۔مرکنٹائل ازم کے حامی ممالک اپنی اپنی نو آبادیات کے متعلق یہی رویہ رکھتے تھے''(۱۴)

مرکنٹائل ازم نے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔اس سے یہ ہونے لگا کہ اپنے مفاد کے لیے سب کچھ کر گزرو۔چنانچہ ایک کا منافع دوسرے کا نقصان بن گیا۔جس سے یہ ثابت ہونے لگا کہ جب تک دوسرے کو نقصان نہ پہنچاؤ گے خود کا بھلا نہیں ہو سکتا۔اس کھیل میں تمام سرمایہ دار اکٹھے ہو گئے۔اس کھیل میں 'جنگ' ضروری قرار پا گئی تھی۔بعض جگہ سرمائے کے حصول کے لیے اور بعض جگہ نو آبادیات کے حصول کے لیے جنگیں لڑی گئیں۔ان میں سے بعض جنگیں 'تجارتی جنگیں' کے نام سے اور بعض مذہب کے نام پر لڑی گئیں۔ان دنوں جو جنگیں بظاہر بڑے اونچے اور اہم مقاصد کی خاطر لڑی جا رہی ہیں وہ بھی تجارتی مفاد سے زیادہ کچھ مقصد نہیں رکھتیں۔

اسی عہد میں ایڈم سمتھ کی کتاب "دولتِ اقوام" شائع ہوئی۔اس کتاب کی اشاعت سے تجارتی نظریہءِ زر کی عمارت ڈھے گئی اور چاروں طرف آزاد مسابقت کا نظریہ فروغ پانے لگا۔یہ کتاب پابندیوں سے رہائی کے لیے سرمایہ داروں کے نزدیک آسمانی صحیفے سے کم نہ تھی۔(۱۵)

۱۶۴۸ء کے برطانوی انقلاب کے بعد ۱۷۷۹ء کا انقلابِ فرانس یورپی معاشرے میں بنیادی تبدیلی کا مظہر ہے اس میں جیت سرمایہ دار طبقے کی ہوئی۔یہاں تاریخ میں پہلی بار بورژوا طبقے نے اقتدار سنبھالا اور صنعتی طرزِ حیات کو فروغ دیا۔

جاگیرداری نظام میں ترقی پانے والی مشینی صنعت موجود تھی۔مرکنٹائل ازم ختم ہو چکا تھا۔انقلابِ فرانس کے باعث کلیسا کا کردار سماج میں سے ختم ہو چکا تھا۔اب دنیا کے سامنے آزاد مسابقت کے دور میں

ایک نیا عہد ابھر رہا تھا۔ یہ عہد 'مشین کا عہد' تھا۔ اس عہد کے ذریعے جو نظامِ معیشت ابھرا وہ سرمایہ داری نظام ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام ابتدا میں بڑا خوش کن اور مساوات کا حامل نظر آتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ سامراجی شکل اختیار کر گیا۔ اس نظام کے تضادات اور استحصالی رویئے نے سماج میں جدید بیگانگی کو پیدا کیا۔

کارل مارکس کے مطابق جب کوئی چیز اپنے ذاتی استعمال کے لیے بنائی جاتی ہے تو اس پر اٹھنے والی رقم سرمایہ نہیں کہلاتی جبکہ وہ شے جو بازار میں فروخت کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے اس پر اٹھنے والی رقم سرمایہ کہلاتی ہے۔ برائے فروخت شے بازار میں جا کر فروخت ہوگی اور صرف شدہ رقم سے زیادہ سرمایہ لائے گی۔ فروخت کرنے کے لیے تیار کی جانے والی کوئی بھی شے 'جنس' کہلاتی ہے۔ کسی بھی خام مال پر جب انسانی محنت صرف ہوتی ہے تو جنس وجود میں آتی ہے۔ یہی جنس سرمایہ داری نظام کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے۔

اجناس کی خرید وفروخت منڈی میں کی جاتی ہے۔ اس لیے منڈیوں کی تلاش اور مال کی کھپت سرمایہ داروں کا بڑا مسئلہ رہا ہے۔ منڈیوں کی تلاش اور اجارہ داری کی خواہش نے لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ سرمایہ داری نظام میں اجناس کا تبادلہ طلب و رسد کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس لیے یہ نظام ظلم اور استحصال کا نظام ہے۔ اس نظام کے تحت محنت کار کی قوتِ محنت کا استحصال ہوتا ہے۔ یہ استحصال سرمایہ دار قدرِ زائد کے ذریعے کرتا ہے۔

نفع کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ خرید وفروخت سے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ خرید وفروخت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جو شخص جنس خریدتا ہے وہ روپیہ بیچتا ہے، اور جو روپیہ بیچتا ہے وہ جنس خریدتا ہے۔ یعنی ایک شخص بیک وقت خریدتا بھی ہے اور بیچتا بھی ہے۔ اس عمل سے قدرِ اصل پیدا ہوتی ہے لیکن ایک سرمایہ دار قدرِ اصل کے لیے سرمایہ کاری نہیں کرتا بلکہ وہ صرف منافع کے لیے ایسا کرتا ہے اور منافع اسے قدرِ زائد سے حاصل ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ معاشی زندگی کا وہ کون سا مقام ہے جہاں پر قدرِ زائد پیدا ہوتی ہے۔

قدرِ زائد پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مزدور ہے۔ مزدور ایک ایسا شخص ہے جو اپنی محنت کی طاقت بیچ کر اجرت حاصل کرتا ہے۔ اس اجرت سے وہ دوبارہ محنت کرنے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔ لیکن اصل میں ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار اس کی ضروری محنت خریدتا ہے لیکن اسے زائد محنت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مارکس قدرِ زاید کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مزدور دن کا نصف حصہ تو اپنے لیے اور باقی نصف حصہ سرمایہ دار کیلیے کام کرتا ہے۔" (۱۶) یعنی سرمایہ دار مزدور کا استحصال کر کے قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ یعنی ایک مزدور اگر دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا ہے تو چھ گھنٹے اپنے لیے کام کرتا ہے اور باقی چھ گھنٹے سرمایہ دار کے لیے کام کرتا ہے۔ پہلے کے چھ گھنٹے اس کی ضروری محنت ہے اور باقی کے چھ گھنٹے قدرِ زائد پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ مارکس اس کی مثال یوں دیتا ہے:

"ایک یومِ کار جو بارہ گھنٹے کا ہو اس کی پیداوار بیس پونڈ وزنی سوت ہوتی ہے۔ جس کی

قیمت تیس شلنگ ہے۔اس قیمت کا 8/10 واں یا 24 شلنگ صرف اس میں آلات پیداوار کی قیمت کے نمودِثانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔(بیس پونڈ روئی کی قیمت بیس شلنگ، تکلے کا گھسنا چار شلنگ) لہٰذا یہ جاری سرمایہ رہا باقی 2/10 واں حصہ یعنی چھ شلنگ سو وہ نئی قیمت ہے جو کتائی کے دوران پیدا ہوئی ہے۔اس میں سے آدھی دن کی قوتِ محنت یا متغیر سرمائے کو بحال کرتی ہے اور باقی آدھی قدرِ زائد بنتی ہے جو تین شلنگ کے بقدر ہے۔
اس طرح بیس پونڈ دھاگے کی مجموعی قیمت حسب ذیل انداز میں بنتی ہے: تیس شلنگ دھاگے کی قیمت= 24 جاری+3 شلنگ متغیر=3 شلنگ زائد کے۔''(۱۷)

اب اگر اس مثال کو بغور دیکھیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ بیس پونڈ سوت کی قیمت بیس شلنگ ہے۔لیکن اس کی مارکیٹ ویلیو تیس شلنگ ہے۔باقی کے دس شلنگ میں سے چار شلنگ تکلے کی گھسائی اور چھ شلنگ کی محنت شامل ہے۔اب سارا مسئلہ اس محنت میں پیدا ہوتا ہے۔مزدور کے ساتھ جو اجرت طے ہوتی ہے وہ تین شلنگ پیدا کرنے کی ہے لیکن سرمایہ دار اپنی عیاری سے اس سے چھ شلنگ کی قوتِ محنت کام میں لاتا ہے۔ جس سے مزدور کو نقصان ہوتا ہے اور سرمایہ دار فائدے میں رہ جاتا ہے۔یہی وہ زائد محنت ہے جس سے سرمایہ وجود میں آتا ہے۔زائد محنت کا یہ عمل قدرِ زائد پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں بیگانگی کو بھی پیدا کرتا ہے۔

سرمایہ داری نظام میں آلاتِ پیداوار پر سرمایہ دار کی اجارہ داری ہے۔مزدور کے پاس صرف قوتِ محنت ہے لہٰذا وہ اسے سرمایہ دار کے ہاتھ ہر حال میں فروخت کرنا پڑتی ہے۔سرمایہ دار اس قوتِ محنت کو کام میں لا کر اشیا بناتا ہے جس کی فروخت سے اسے منافع حاصل ہوتا ہے۔اس روپے سے وہ مزید اشیا بناتا ہے اور مزید روپیہ پیدا کرتا ہے۔اب ایک سرمایہ دار جس قدر زیادہ اشیاء بنائے گا اُسی قدر وہ مزدور کا استحصال کرے گا اور اپنے لیے سرمایہ اکٹھا کرے گا۔

صنعتی انقلاب لانے کے لیے دو اشیا ضروری تھیں، پہلے سرمایہ پھر صنعتی مزدور۔دونوں کا حصول اتنا سادہ اور آسان نہ تھا۔زرعی مزدور کو صنعتی مزدور بنانے میں اور گھریلو دست کار کو مشینی اور کارخانہ مزدور بنانے میں کئی ہفت خواں طے کرنے پڑے۔دوسری طرف بڑی صنعتوں کے قیام کے لیے جس قدر سرمائے کی ضرورت تھی وہ پیٹ کاٹ کر جمع نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس کے لیے تجارت کا راستہ اختیار کیا گیا۔اس تجارت میں لوٹ مار، چھینا جھپٹی، ڈکیتیاں، وسائل پر ناجائز قبضے سب شامل تھا۔اس کے لیے تجارتی اور صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔صلیبی جنگوں کے ختم ہوتے ہی وینس، جینوا، اور پیسا میں دولت مند شاہی اقتدار میں آگئے جنھوں نے مالِ غنیمت سے اپنے گھر بھر لیے۔دولت کا سیلاب مشرقی ممالک سے چلا اور مغربی گھروں میں جا بسا۔(۱۸)

یہ سرمایہ بھی بھاری صنعت کے لیے ناکافی ثابت ہوا چنانچہ خونریزی کی مزید داستانیں رقم کی

گئیں۔ اس بار میکسیکو اور پیرو کے ریڈ انڈینز اور افریقہ کے غلام کام آئے۔ ان لوگوں کو زبردستی کانوں میں ٹھونس کر سونے، چاندی اور دیگر معدنیات حاصل کی گئیں۔ اس مارا ماری میں انگریز، ہسپانوی، ڈچ اور پرتگیزی شامل تھے۔ یہ لوگ دولت کی خاطر ایک دوسرے کو مارنے اور چھیننے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی الگ سے مکاری کی داستانیں قائم کر رہی تھی۔ یہاں پر امن ہندوستانی اس کے مشقِ ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔

نوآبادیاتی تجارت سرمایہ داروں کی جنت ثابت ہوئی اور افریقہ کے کالی کھال والے انسان بہترین مالِ تجارت۔ برطانیہ کے لیور پول اور مانچسٹر جیسے قصبات رات ورات بڑے بڑے انڈسٹریل شہر بن گئے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ایچ ہیری ول نے 1840ء میں آکسفورڈ میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا "ان شہروں کی تیزی سے بڑھنے والی دولت کا موجب افریقی حبشیوں کی عرق ریزیوں اور تباہ حالیوں کی مرہونِ منت ہے۔"(۱۹) یہ افریقی غلام جو جبری مزدور بنا کر امریکہ کو فروخت کیے جا رہے تھے اس کا آغاز پرتگالیوں نے کیا پھر ان کی دیکھا دیکھی دوسری یورپی اقوام بھی اس 'کارِ خیر' میں کود پڑیں۔ حتیٰ کہ حکمران طبقے تک کے ہاتھوں پر ان غلاموں کے لہو کو شناخت کیا جاسکتا تھا۔ اس مہم جوئی میں ملکہ الزبتھ نے ہاکنز کے ساتھ مل کر مالِ تجارت امریکہ بھیجا اور کامیاب واردات کے بعد ہاکنز کو Knight کا خطاب دیا۔(۲۰) جبری مزدوروں کی تجارت کا یہ سلسلہ سولھویں اور سترھویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ مارکس کے بقول: "اگر روپیہ اپنے ایک رخسار پر خون کے دھبے لے کر جنم پاتا ہے تو سرمایہ سر سے پاؤں تک ایک ایک روئیں کو خون سے نہلائے اور خاک میں لتھڑے ہوئے وجود میں آتا ہے۔"(۲۱)

افریقی غلام امریکی زمینوں اور کانوں کا رزق بن کر سرمایہ داروں کو خام مال مہیا کرتے تھے۔ اب اس خام مال کو بھٹیوں میں تپانے کے لیے اور 'جنس سازی' کے لیے مزید مزدور درکار تھے۔ اس کے لیے مزدور طبقے سے (زرعی غلام اور گھریلو دستکار) ان کے ذرائع پیداوار (زمین اور اوزار) چھین کر انھیں بے دخل اور بے روزگار کیا گیا۔ اب ان بے کسوں کے پاس اپنی قوتِ محنت بیچ کھانے کے سوا کچھ بچا ہی نہ تھا۔ سو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انھوں نے اپنی قوتِ محنت سرمایہ دار کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس خوئے غلامی کو پختہ تر کرنے کے لیے احاطہ بندی تحریک کے ذریعے کسانوں کو وسیع پیمانے پر زمینوں سے بے دخل کیا گیا اور گھریلو صنعت کو بالجبر بند کر کے فیکٹری سسٹم اور کارخانہ داری کو رواج دیا گیا۔ یوں کسان اور دستکار سرمایہ داروں کی خواہشات کا ایندھن بن کر مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ اس دور میں یہ فضا تیار کر دی گئی تھی کہ مشین کم وقت اور کم لاگت میں بہتر اشیا تیار کرتی ہے۔ اس جنگ میں مشین کی جیت یقینی تھی، سو وہی جیتی اور وہ ہزاروں کی تعداد میں دستکار جو چھوٹے چھوٹے گھریلو کارخانوں کے مالک تھے۔ بے روزگار ہو کر اجیر کاریگروں کی حیثیت سے اجرت پر کام کرنے لگے۔"(۲۲) عیسائیت میں 'کلیسا' مذہبی حوالے سے ایک متبرک اور قومی طاقت کی علامت تھا۔ کلیسا زمین پر اقتدارِ اعلیٰ کا مالک تھا۔ پوپ کا فرمان حکمران طبقے کے

اختیارات پر مقدم تھا۔ اس لیے کلیسا کی زمینیں اور دولت بے پناہ تھی۔ حکمرانوں سے لیکر عام رعایا تک کی وفاداری اور عقیدت کلیسا کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ حکمران طبقے کی حالت یہ تھی کہ وہ بظاہر تو کلیسا کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے اس کے مخالف تھے۔ حکمران طبقوں اور کلیسا کے درمیان مغائرت کا یہ سلسلہ زیر زمین سطح پر بہت دیر تک چلتا رہا۔ اس مغائرت میں اختیارات کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس دولت کا بھی معاملہ تھا جو کلیسا کے خزانے میں جمع ہوتی تھی لیکن خراج کی شکل میں سرکاری خزانے تک نہیں پہنچتی تھی۔ یوں بادشاہ کلیسا کو اپنا حریف خیال کرتا تھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ حالات بدلے۔ حالات بدلے، تو حالات کا تناظر بدلا۔ کلیسا جو انتہائی متبرک ادارہ تھا عوام کی طرف سے اس کی اتھارٹی کو چیلنج کر دیا گیا۔ اس دور میں چرچ کا کام جائز و ناجائز ذرائع سے دولت اور جائیداد پیدا کرنا اور اپنی ہوس کی پیاس بجھانا رہ گیا تھا۔ ارباب کلیسا قول و فعل کے تضاد کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ اپنے وعظوں اور تقاریر میں جو کچھ کہتے اس پر خود عمل پیرا نہیں ہوتے تھے۔ ''دولت کا ناجائز اور جائز ہر راہ سے بٹورنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔'' (۲۳)

قرونِ وسطیٰ کے ایک شاعر کی نظم ہے جس میں اس دور کے کلیسا اور اربابِ کلیسا کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں وہ نظم درج کی جاتی ہے جس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں:

''میں دیکھتا ہوں پوپ امانت میں خیانت کر رہا ہے
یہ ہمیشہ دولت سمیٹتا رہتا ہے
لیکن پھر بھی غریب اس کی نگاہِ کرم کے مستحق نہیں ٹھہرتے
یہ ہر طرح سے دولت گھسیٹنا چاہتا ہے
اور عیسیٰ کو پیروؤں کے زبردستی اپنی اندھی تقلید پر مجبور کرتا ہے
تاکہ یہ سنہرے ملبوس میں آرام سے زندگی گزار سکے
ہر معزز صدر کلیسا کی حالت کچھ پوپ سے بہتر نہیں ہے
یہ صبح صادق سے لیکر شام کی تاریکی تک
اپنا وقت ان منصوبوں میں گزارتا ہے
کہ جس طرح بن پڑے جائز اور ناجائز ہر شخص کو لوٹ لے
ہمارے بشپ بھی اسی طرح کے گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہیں
تم اپنے سونے سے ان کی سرکاری مہر خرید سکتے ہو
جہاں تک عام پادریوں اور چرچ کے چھوٹے عہدہ داروں کا تعلق ہے

خدا ہی بہتر جانتا ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں
جن کی روزمرہ زندگی کو ان کے روزمرہ کے اعمال جھٹلاتے ہیں
وہ چاہے جاہل ہوں یا عالم
وہ ہر مقدس نشانی کو بیچ کھانے کا عہد کر چکے ہیں
عوام کی مقدس قربانیاں بھی ان کا مال تجارت ہیں
چھوٹے اور بڑے پادری نمائش کرتے ہیں
ان سخت اور خشک قوانین پر عمل کرنے کا
لیکن یہ ان کی ایک بے کار ریاکاری ہے
وہ جس طرح سے رہتے ہیں ہم جانتے ہیں (۲۴)

یہ وہ حالات تھے وہ جنہوں نے مارٹن لوتھر کو پیدا کیا۔ مارٹن لوتھر نے ''اصلاح مذہب'' کے نام پر تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اس کی بنیاد پر ''پروٹسٹنٹ' فرقہ وجود میں آیا جس نے لوگوں کے لیے مذہبی آزادیوں کے دروازے کھول دیئے۔ مذہب مخالفت طبقات جو پہلے تو رومن کیتھولک کے اثر سے نکلے اور پروٹسٹنٹ بنے پھر انھوں نے پروٹسٹنٹ کو بھی خیر آباد کہا اور Humanism کے پیروکار بن گئے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مذہب انسان کا استحصال کرتا ہے اور مذہبی شعائر کی پابندی بھی ایک طرح سے بیگانگی کو پیدا کرتی ہے۔ فیور باخ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ خدا کی عبادت بھی ایک طرح سے بیگانگی ہے۔

> "Feuerbach differed from Hegel in arguing that worship of God is itself a form of alienation, because it projects human qualities to an external idea rather than relishing them as part of the self.(25)

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں دنیا دو بڑے طبقات میں تقسیم ہوگئی ایک تو مراعات یافتہ طبقہ تھا جسے زندگی کی تمام سہولیات اور آسائشیں حاصل تھیں اور وہ ہاتھ ہلائے بغیر دوسروں کی محنت کے ثمرات سے لطف اندوز ہو رہے تھے جبکہ دوسری طرف سخت مشقت کرتے انسان تنگ و تاریک جھونپڑوں میں جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ مراعات کے حامل افراد محل نما مکانوں میں رہتے تھے اور محنت کشوں کے لیے ایسے قوانین بناتے تھے کہ وہ اس حالت میں پڑے رہیں اور سر اٹھانے کے قابل نہ ہوں۔ یہ دونوں طبقات اپنے عادات و مزاج، خیالات اور محسوسات تک ایک دوسرے سے جدا تھے۔ ان کی نسلیں جدا، ان کی غذائیں جدا

ان کے قوانین جدا تھے۔ اگر چہ طبقاتی تقسیم نئی چیز نہیں تھی یہ جاگیرداری نظام میں بھی موجود تھی لیکن صنعتی سرمایہ داری نظام میں یہ خلیج اپنی انتہائی شکل میں نظر آتی ہے۔ جاگیرداری عہد میں سرف کو کچھ حقوق بھی حاصل تھے لیکن اس نظام میں محنت کش سراسر سرمایہ دار کے رحم وکرم پر تھے۔

صنعتی سرمایہ دار مزدور کو اجرت دینے میں بڑے بخیل واقع ہوئے تھے۔ وہ عورتوں اور بچوں سے بھی محنت کرواتے تھے اس لیے کہ ان کو اجرت کم دینا پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ مردوں کی بے روزگاری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس دور کے سرمایہ دار مزدور بچوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ بچوں کی تعلیم بارے ان کے خیالات انتہائی ظالمانہ نوعیت کے تھے:(۲۶)

بدتر مالیاتی حالات، بے روزگاری، غلیظ بدبودار گھر، کچرے کے ڈھیروں پر پلتے انسان، مزدوروں نے اپنی تباہ حالی دیکھی تو وقت کے آئینے میں انھیں خود کو دیکھانہ گیا۔ جب انھوں نے اپنی شناخت ختم ہوتے دیکھی تو صبر جواب دے گیا اور ان کے اندر انتقامی جذبات پیدا ہو گئے۔ انھوں نے اپنی مفلسی اور بھوک کا ذمہ دار سامنے موجود مشینوں کو قرار دے کر انھیں توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا۔ فاقہ کشی کا یہ انتقامی رویہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا چنانچہ تشدد کے نتیجے میں املاک پر تباہی آئی۔ سرمایہ داروں نے اپنی مشینوں اور استحصال کے اڈوں کو پرزہ پرزہ ہوتے دیکھا تو ریاست (جو سرمایے کے تحفظ کے لیے قائم ہوئی تھی) کے دروازے پر دستک دی۔ چنانچہ ۱۸۱۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے مشینیں توڑنے والوں کو سزائے موت کا مرتکب قرار دے دیا۔(۲۷)

یہ حقیقت بڑے تلخ تجربات کے بعد مزدوروں کی سمجھ میں آئی کہ انھیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے انجمن قائم کرنی چاہیے۔ چنانچہ ماضی میں وقتاً فوقتاً محنت کشوں کی طرف سے قائم کی گئی۔ انجمنیں ایک نئی شکل میں ڈھل کر ٹریڈ یونین کے نام سے سامنے آئی محنت کشوں نے گلڈ سسٹم کو رد کر دیا اور اس کی جگہ ٹریڈ یونین کو قائم کرلیا۔ آج کی ٹریڈ یونین ایک ایسی جماعت ہے جو ایک صنعت کے تمام مزدوروں کو اپنے مشترکہ مفاد کی حفاظت کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کرنا سکھاتی ہے۔(۲۸)

سرمایہ دار اور محنت کشوں کی لڑائی بہت پرانی ہے۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ مزدور طبقہ ہمیشہ منتشر حالت میں رہے اور کبھی بھی متحد ہو کر حقوق مانگنے کی بات نہ کرے۔ صنعتکاروں کی طرف سے مزدوروں کا منظم ہونا ہر عہد میں جرم سمجھا جاتا ہے۔ چودھویں صدی سے مزدوری کی تنظیمیں خلاف قانون قرار دی جاتی رہی ہیں۔(۲۹) لیکن یہ کسی نہ کسی شکل میں چولا بدل کر چلتی رہی ہیں۔

صنعتی زندگی کے پھیلاؤ کے باعث مزدوروں کی بستیاں شہروں میں بس گئیں میل ملاپ کے باعث ٹریڈ یونین نے بہت جلد ترقی کرلی۔ صنعتی انقلاب انگلستان سے شروع ہوا تھا۔ اس لیے ٹریڈ یونین کا قیام بھی یہیں پر عمل میں لایا گیا جو بہت جلد دوسرے صنعتی ممالک میں بھی پھیل گیا۔ ٹریڈ یونین کا قیام سرمایہ

دار طبقے کے لیے ایک بری خبر تھی چنانچہ اس کی مخالفت کی گئی اور اسے خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اس ضمن میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جس نے انگلستان کی پیروی نہ کی ہو۔ ٹریڈ یونین کے پھیلاؤ کو روکنے اور اس ''فتنے'' کو ختم کرنے کے لیے تمام تر حربے استعمال کیے گئے۔ اس کے ممبران اور عہدے داران کی گرفتاریاں اور تشدد، ان پر مقدمات بنائے گئے۔ صدور کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ (۳۰) لیکن ان تمام آئینی (۱۸۴۵ء کا قانون جو مزدوروں کو تنظیم سازی سے روکتا ہے) اور غیر آئینی اقدامات کے باوجود ٹریڈ یونین چلتی رہی۔ اس کے ممبران زیرِ زمین چلے گئے اور چھپ چھپا کر کام کرتے رہے۔ ٹریڈ یونین کے بڑے ہتھیار ہڑتال کرنا اور دھرنا دینا تھے جن سے مزدور طبقے نے خوب خوب کام لیا۔

کلاسیکی معاشیات سرمایہ دار طبقات کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ یہ معاشیات محنت کشوں سے اطاعت اور فرمانبرداری کی توقع رکھتی ہے۔ یہ ہڑتالوں اور کام کے اوقات کو کم کروانے کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ سرمائے کو اکٹھا کرنے اور مزدور کی اجرت کو بازاری سطح پر رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے جبکہ پسماندہ طبقوں کی معاشیات اسے غیر فطری اور استحصالی رویہ قرار دیتی ہے۔ ان کے بقول یہ نظام کارخانہ دار کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔ جس میں مزدور اپنے فطری حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ تاجروں اور سرمایہ داروں نے مارکیٹ پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے کاروبار کی مختلف شکلوں کو رواج دیا جن میں ٹرسٹ کا قیام، کارٹل کا قیام، بنکوں کا قیام، سٹاک ایکسچینج وغیرہ شامل ہیں۔ کارٹل اور ٹرسٹ پیداوار کی مقدار اور قیمت اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں۔ بنکوں کا لین دین اس طرح رکھا کہ بڑے بڑے سرمایہ دار ہشیاری سے دولت سمیٹ کر چھوٹے کاروباری طبقے کو دیوالیہ کر دیتے تھے۔ (۳۱)

سامراج اور عالمی امن

سرمایہ دار زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے جنس پیدا کرتا ہے۔ اس کی اجناس جب ملکی کھپت سے بڑھ جاتی ہیں تو وہ نئی منڈیاں اور نئے بازار تلاش کرتا ہے تاکہ وہاں اس کی فاضل مصنوعات کی کھپت ہو سکے۔ سرمایہ دار کی ہوس کا پہلا شکار کالی کھال والا افریقہ ہوا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے افریقہ کے مختلف حصوں پر یورپ کی مختلف اقوام نے قبضہ کر کے اپنی اپنی منڈیاں قائم کر لیں۔ نو آبادیات میں فاضل مصنوعات کی فروخت کے ساتھ ساتھ خام مال جیسے، روئی، لوہا، تانبا، سونا چاندی وغیرہ کا حصول بھی جاری رکھا تاکہ زیادہ مصنوعات تیار کر سکیں (ہندوستان کا تاریخی ''کوہ نور ہیرا'' آج بھی برطانوی سامراج کی یادگار کے طور پر ملکہ برطانیہ کے تاج کی زینت ہے) سامراجی طاقتوں نے (وسائل اور منڈیوں کے) ان سرچشموں پر قبضہ کرنے کے لیے عالمی امن کو خطرے میں ڈال دیا۔ نو آبادیات کی اس رسہ کشی میں بعد میں امریکہ بھی شامل ہو گیا جو ایک بڑے حصہ دار کے طور پر اپنا خراج وصول کرنے لگا چنانچہ ذیل کے اس اقتباس سے ان امریکی عزائم کا پتہ چلتا ہے جو بعد میں آ کر حقیقت بنتے ہیں۔ چنانچہ سینیٹر جے بی ورج (Albert J.B

(Veridge) بوسٹن کی ایک تاجر کمپنی کے نام ۱۸۹۸ء میں لکھتا ہے:

''امریکہ کے کارخانے امریکی عوام کی ضروریات سے زیادہ سامان تیار کر رہے ہیں۔ امریکہ کی زمین اتنا غلہ پیدا کر رہی ہے جتنا امریکی باشندے استعمال نہیں کر سکتے۔ قسمت نے ہمارا طریق کار متعین کر دیا ہے۔ دنیا کی تجارت اب ہمارے ہاتھ میں آنی چاہیے اور وہ آئے گی ہم اسے اسی طرح حاصل کر لیں گے جس طرح مادرِ انگلستان نے ہم کو حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ بڑی بڑی نوآبادیات جو اپنی حکومت کا نظام خود سنبھال سکیں گی ہمارا جھنڈا لہرائیں گی اور ہمارے ساتھ تجارت کر کے ہماری چوکیوں کے آس پاس نشوونما پائیں گی۔''(۳۲)

نوآبادیات اور منڈیوں پر قبضے کی جنگ ہمیں بیسویں صدی میں لے آتی ہے۔ بیسویں صدی خوب ترکی تلاش اور خون آشام واقعات کی یادگار کے طور پر ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس صدی میں دو عالمی جنگیں لڑی گئیں جن کے نتیجے میں تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر دیکھنے کو ملے اور غلام اقوام نوآبادیاتی زنجیریں توڑ کر آزاد ہوتی گئیں۔ اس صدی میں جہاں سائنسی ترقی اپنے کمال پر نظر آتی ہے وہاں تمدن کے لیے خطرات بھی اتنے ہی زیادہ پیدا ہوئے ہیں۔

رسہ کشی کے اس کھیل میں (جو معصوم دنیا کے مقدر کے میدان پر کھیلا جا رہا ہے) ایک طرف کامیاب استعماری طاقتیں (انگلستان، فرانس، امریکہ) اپنے سامراج کو مستحکم کر رہی تھیں تو دوسری طرف کچھ نئے شکاری اپنے دانت تیز کر رہے تھے جن میں جرمنی اور اٹلی نمایاں ہیں۔ چنانچہ جرمن نے اٹلی کے ہمراہ برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات میں حصہ دار بننے کے لیے لنگوٹ کس لیے اور میدان میں کود پڑے، چنانچہ اس کشمکش کا نتیجہ پہلی عالمی جنگ کی صورت میں سامنے آیا جو ۱۹۱۴ء میں اتحادی اور محوری طاقتوں کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں محوری طاقتوں کو شکست ہوئی جن میں جرمنی کے ساتھ ساتھ ترکی بھی شامل تھا۔ اس جنگ میں جرمنی کو شکست تو ہو گئی لیکن اس کے عزائم میں کمی نہ ہوئی چنانچہ اس کے یہی عزائم دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ مطلق العنان حکومتوں کے خاتمے کی جنگ تھی تاکہ دنیا میں جمہوریت کو مضبوط کیا جا سکے لیکن اصل میں یہ مفادات کی جنگ تھی جس میں استعماری طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوئیں۔(۳۳)

اس جنگ میں سماجی سطح پر کافی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی۔ ہر صحت مند اور کام کے بندے کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا جبکہ صنعتی اور دیگر شعبوں میں ان کی جگہ پر عورتیں آ گئیں۔ یورپ بھر میں لوگوں کے پیشے تبدیل ہو گئے۔ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کو عسکری مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ خبروں کی ترسیل میں پراپیگنڈے سے کام لیا گیا۔ عسکری ضوابط توڑ دیئے گئے۔ نہتے عوام پر فضائی حملے کیے گئے۔ خوراک اور ایندھن کے ذخیرے تباہ کیے گئے بڑے بڑے شہر محاصروں اور شبینہ یلغاروں کی زد میں تھے۔ لندن اور پیرس جیسے شہروں

میں لوگ رات کو جاگ کر موت کا انتظار کرتے رہتے۔ موت خوف اور دہشت کی ان تصویروں کے گرد رقص کناں رہتی۔ بم پھٹنا، توپوں کا دھاڑنا، آگ بجھانے والی گاڑیاں اور ایمبولینس کی رات دن چیخ چنگھاڑ، ان حالات نے لوگوں کا سکون چھین کر ان کے ذہنوں پر خاص اثرات مرتب کیے۔ لوگ جنگ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ بدمزاج بھی ہوتے گئے۔

خدا خدا کر کے جنگ ختم ہوئی تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب امن و سکون کے دن آنے والے ہیں۔ لیکن یہ امن عارضی امن ثابت ہوا۔ زخمی 'چیتا' مرہم پٹی کے بعد دوبارہ 'ببر شیر' کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ ببر شیر کو شکست دے کر جنگل کا بادشاہ بن جائے گا۔ چنانچہ دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس جنگ میں جاپان بھی کود پڑا۔ چنانچہ جاپان چینی سرحدوں کو روندتا ہوا ہانگ کانگ، سنگاپور، سماٹرا ملایا، جاوا اور بورنیو وغیرہ پر قابض ہو گیا۔ جرمن فرانس میں داخل ہو گئے اور یہاں سے آگے ہالینڈ، ڈنمارک اور ناروے پر اٹلی کے ہمراہ قابض ہو گئے۔ جرمن اور اٹلی کی افواج شمالی افریقہ میں داخل ہوئیں اور فتوحات کرتی ہوئی جب مصر میں داخل ہوئیں تو وہاں اتحادی افواج سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہاں انگریزوں نے امریکی امداد کے باعث جرمن افواج کو شکست سے دوچار کر دیا چنانچہ جرمن افواج مصر سے شکست کھا کر واپس ہٹیں اور ۱۹۴۱ء میں روس میں داخل ہو گئیں۔ ادھر اتحادی افواج ان سے اپنی مقبوضات واگزار کراتے ہوئے جرمنی میں داخل ہو گئے ادھر روس ان کا تعاقب کرتا ہوا جرمنی میں آن گھسا، یوں جرمنی کو روس اور امریکہ نے دو دو حصوں میں بانٹ لیا۔ ادھر جاپان کے بڑھتے قدم امریکہ نے اس کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر روک دیئے اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ یوں یہ جنگ جاپان کی تباہی اور جرمنی کی شکست کے بعد اس کی تقسیم پر ختم ہوئی۔ اس جنگ کے خاتمے پر مسولینی کو خود اطالویوں نے پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ (۳۴)

جنگ چھوٹی ہو یا بڑی اپنے ساتھ تباہی اور بربادی ہی لے کر آتی ہے۔ جنگیں انسانیت سوزی کی بدترین مثالیں رقم کرتی ہیں۔ چنانچہ عالمی جنگیں انسانیت سوزی کی بدترین مثالیں ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے مقابلے میں دوسری جنگ زیادہ ہولناک ثابت ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں صنعت و حرفت تباہ ہو گئی اور معیشت کو خوب نقصان پہنچا۔ انسان نے اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے انسانی خون کو نہایت ارزاں کر دیا۔ جنگ کے نتیجے میں لوگوں کے مزاج، عادات و اطوار، رہن سہن، معمولات زندگی اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اتنی تباہی و بربادی، کسمپرسی، لاچاری اور بے بسی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر لوگوں کے عقائد میں بھی تبدیلی آئی۔ اس سے پہلے مذہب ایک مضبوط قوت کے طور پر انسانی عقائد میں موجود تھا لیکن اس جنگ کے نتیجے میں دانشوروں نے خدا پر بھی سوالات اٹھا دیئے اور یوں ایک بڑے طبقے میں نفی خدا کا تصور پروان چڑھا۔ اس سلسلے میں فرانس کے دانشور ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو، سیمون دی بوار وغیرہ پیش پیش تھے۔ ان لوگوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسانیاتی فلسفے کو رواج دیا اور کسی بھی

ماورائی تصور کی نفی کی۔ اس تصور کو مستحکم کرنے میں آئینسکو، سیموئیل بکٹ، دوستوفسکی اور کافکائی تحریریں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس تصور کے پروان چڑھنے سے زندگی کی بے معنویت نمایاں ہوگئی۔ زندگی کی بے معنویت جب عقائد میں در آئی تو خوف اور دہشت کے باعث لوگوں کی شخصیت کی سالمیت بکھر گئی۔ مذہبی اخلاقیات کا تصور قصہ پارینہ ہوا اور نئی قسم کی اخلاقیات مرتب ہونے لگی۔ لوگ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تذلیل کرنے لگے زندگی کی ارزانی اور بے وقعتی بڑھ گئی۔ انسانوں میں نفرت، جارحیت اور تشدد کے عناصر بڑھ گئے۔ لوگ اذیت پسند اور سادیت پسند ہو گئے۔ خاندانی رشتوں پر تباہی آئی اور تنگ نظری میں اضافہ ہوا۔ سماج میں جنسی لذت پسندی، شراب نوشی اور قمار بازی بڑھ گئی۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> ''دوسری جنگ عظیم کے بعد سرمایہ دار دنیا بالخصوص امریکہ اور مغربی یورپ میں اس ذہنی بیماری نے وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ زندگی کی بے وقعتی انسان کی ذات وصفات کی بے حرمتی اخلاقی قدروں کی پامالی، کام چوری، مردم بیزاری اور فرار، قتل اور خودکشی کی بڑھتی ہوئی وارداتیں، جارحیت اور تشدد برائے تشدد کا پرچار، جنسی حیوانیت کے مظاہرے، دوستی ہمسائیگی اور خاندانی رشتوں کی شکست وریخت غرضیکہ بیگانگیٔ ذات کے ان گنت روپ ہیں جو مغربی دنیا کا معمول بنتے جا رہے ہیں۔ تشخص ذات کے اس زیاں اور بے مقصدیت کے اثرات دورِ حاضر کے مغربی ادب ڈرامہ، فلم، مصوری ہر شعبۂ زندگی میں صاف نمایاں ہیں۔'' (۳۵)

دوسری عالمی جنگ کے بعد استعماری طاقتوں نے نوآبادیات چھوڑ دیں مگر وہاں بالادست طبقات کی مدد سے مرضی کی حکومتیں قائم کر دیں جو ان طاقتوں کے گماشتوں کے طور پر اقتدار پر براجمان ہو گئے۔ یہ گماشتے اس سرمایہ داری نظام کے حامی اور محافظ بن کر سامنے آئے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک میں اب تک نہ تو امن قائم ہو سکا ہے اور نہ وہاں پر زیردست طبقات کی حالت میں کوئی بہتری آئی ہے۔ ان استعماری طاقتوں نے مقامی بالادست طبقات کے ذریعے سیاسی اور معاشی لوٹ گھوسٹ کو قائم رکھا ہوا ہے جس سے عوام کا استحصال جاری ہے۔ ''عہدِ جدید میں قدیم نوآبادیاتی نظام سے نجات کے بعد تیسری دنیا کے آزاد ممالک اس صورت حال کی زندہ علامتیں ہیں۔'' (۳۶) اس استعمار اور استحصال کے باعث ان ممالک میں مزدور طبقے کے حالات میں کوئی بہتری نہیں آسکی۔

بے روزگاری اور عدم تحفظ کا احساس سماج میں ہر سطح پر پھیل رہا ہے۔ یہ احساس محنت کشوں سے لیکر خدمات سرانجام دینے والے ان طبقات میں بھی پھیل رہا ہے جو اس سے قبل خود کو محفوظ تصور کرتے تھے ان میں ڈاکٹر، انجنیئر، استاد، سرکاری ملازم کارخانوں کے منیجر سب شامل ہیں۔ برسوں پہلے یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی انسانی کے تمام مسائل حل کر دے گی۔ مستقبل میں طبقاتی کشمکش ختم ہو

جائے گی اور مرد و زن کو تمام بنیادی سہولیات حاصل ہوں گی نیز ''تیسری دنیا خوشحالی کی راہ پر چلتے ہوئے یورپ امریکہ کے برابر ہو جائے گی۔'' (۳۷) لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ نہ تو انسانوں کے مسائل حل ہوئے ہیں اور نہ طبقاتی تضاد ختم ہوا ہے بلکہ ''مغرب میں لوگوں کی اکثریت کا معیارِ زندگی نیچے آرہا ہے۔ فلاحی ریاست تباہ ہو رہی ہے اور مکمل روزگار قصہ پارینہ بن چکا ہے۔'' (۳۸)

یہ پیشگوئیاں کچھ غلط نہ تھیں سائنسی نقطہ نظر سے ایسا ممکن تھا کہ مزدوری کے اوقات کو کم کر کے پیداوار میں اضافہ اور معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے لیکن استحصالی رویے کے باعث ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ آج سائنس کی ترقیوں کے باوجود غربت، فاقہ کشی، بیماری، غلاظت، نسل پرستی، بے روزگاری اور مارکٹائی زوروں پر ہے۔ دنیا سے غربت کو ختم کرنے کا دعویٰ کرنے والے آج اپنے اقدامات سے خود ہی دنیا کو غریب کیے جاتے ہیں۔ مارکس نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ صنعتی سرمایہ داری میں مزدور کے اوقات کم ہونے کے بجائے بڑھ جائیں گے۔ (۳۹) چنانچہ ٹائم کے ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴ کے ایک شمارے میں بتایا گیا ہے کہ امریکی معیشت میں بہتری ہوئی ہے اور شرح منافع بڑھ گئی ہے۔ ''لیکن مزدور شکایت کرتے ہیں کہ ان کے لیے یہ پھیلاؤ تھکاوٹ لایا ہے۔ ساری امریکی صنعت میں کمپنیاں مزدوروں کی قوت نچوڑنے کے لیے اوور ٹائم استعمال کر رہی ہیں'' (۴۰) مختلف کمپنیوں نے ملازمین کی تعداد کم کر کے اوقاتِ کار کو بڑھا دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ایک آدمی کو تین آدمیوں کا کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ملازمین یہی شکایت کرتے ہیں کہ: ''جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میرے پاس نہانے اور کھانا کھانے کے علاوہ صرف تھوڑی سی نیند کا وقت ہوتا ہے پھر اس کے بعد سب کچھ پھر سے دہرانے کا وقت ہو جاتا ہے۔'' (۴۱)

مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس کے مصنفین کے مطابق حالیہ برسوں میں مزدور پر رفتہ رفتہ دباؤ بڑھا دیا گیا ہے۔ برطانیہ میں دوپہر کے کھانے کا وقفہ ختم کر دیا گیا ہے۔ جرمنی میں ان سے کہا گیا ہے کہ وہ چھٹی کے دن بھی کام کریں۔ ہر جگہ ایک جیسی صورت حال ہے اسی صورت حال میں اعصابی نظام پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہ دباؤ طبی مسائل کا باعث بنتا ہے جس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ یہ مایوسی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ رواں صدی کے شروع میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ معاشی عدم مساوات جتنی بیسویں صدی میں بڑھی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں بڑھی۔ (۴۲)

اکیسویں صدی کی اس ٹیکنالوجی کی حامل ترقی یافتہ دنیا میں بعض ملکوں کی حالت یہ ہے کہ ہر تیسرا بچہ غذائی قلت کا شکار ہے۔ 'سوشلزم اکیسویں صدی' کے مصنفین لکھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے 250 ملین بچے 14 سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کروڑ ہا بچوں کو لونڈی اور غلام بنا کر بیچ دیا جاتا ہے۔ بچیاں جوان ہو کر قحبہ گری کو ذریعہ معاش بنا لیتی ہیں۔ کچھ کو گلیوں میں بھیک منگوانے کے لیے ایک آدھ عضو کاٹ کر زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دیا جاتا ہے۔ بہت سے افراد فاقہ کشی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے گردے بیچ دیتے ہیں۔ جنھیں دولت مند معمولی قیمت میں خرید کر اپنے جسم میں لگوا

لیتے ہیں۔(۴۳) عالمی بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق شمالی امریکہ اور جاپان کی مجموعی آبادی دنیا کی کل آبادی کا 15 فیصد ہے لیکن یہ ممالک دنیا کی مجموعی دولت کے 80 فیصد حصے پر تصرف رکھتے ہیں۔(۴۴) ۱۹۹۹ء میں برطانوی معاشرتی رویوں کے ایک سروے میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں 60 فیصد مزدور اپنے روزگار سے خوش نہیں ہیں۔ وہ تھکاوٹ، کھنچاؤ اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ ماہرین نفسیات نے خبردار کیا ہے کہ یہ صورت حال ان مزدوروں کی جسمانی اور ذہنی حالت کے لیے اچھی نہیں ہے۔(۴۵) سرمایہ داری کی بنیاد حرص وہوس پر قائم ہے۔ یہ نظام طبقاتی تفریق کو پیدا کرتا ہے جس کے باعث سماج میں بیگانگیٔ ذات کا عمل شدت اختیار کر جاتا ہے ذات کی بیگانگی کے باعث 'معاشرہ بے یقینی، نا آسودگی اور ذہنی انتشار روبا کی صورت پھیل رہا ہے۔''(۴۶)

گلوبلائزیشن اور عالمی منڈی کا تصور بھی ایک استعماری رویہ ہے۔ سامراجی قوتیں پہلے لوٹ مار کے لیے ٹینکوں اور گولہ بارود کا استعمال کرتی تھیں اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے یہ کام لیا جارہا ہے۔ عالمی غلبے کے لیے مختلف گروہ سرگرم ہیں۔ ہر گروہ چاہتا ہے کہ وہ عالمی منڈی پر قبضہ کرلے۔ قبضے کی اس دوڑ میں کمپنیاں ضرورت سے زیادہ مال تیار کر کے مارکیٹ میں بھیج دیتی ہیں جس سے کساد بازاری پیدا ہوتی ہے، اس چیز کو اینگلز ''معیادی تجارتی بحران''(۴۷) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایسا نظام جس کی بنیاد ذاتی منافع کے لیے محنت کش کے استحصال پر قائم ہو کبھی بھی فلاحی معاشرے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ یہ نظام بیگانگی کی مختلف صورتیں تو پیدا کر سکتا ہے لیکن معاشرے میں امن، سکون، آشتی اور انسانی و معاشی مساوات کا علمبردار کبھی نہیں بن سکتا۔

☆☆☆☆

حواشی

۱۔ مسرت حسن، ڈاکٹر و دیگر، ''قدیم انسان اور فن مصوری'' لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶، ص ۱۳
۲۔ ایضاً
۳۔ مجید امجد ''کلیاتِ مجید امجد'' مرتبہ؛ خواجہ محمد زکریا'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۴۹
۴۔ مسرت حسن، ڈاکٹر و دیگر، ''قدیم انسان اور فن مصوری'' ایضاً ص ۱۴
۵۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، ''انسانی شعور کا ارتقاء'' کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۲، ص ۹
۶۔ سبط حسن، ''موسیٰ سے مارکس تک''، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵، ص ۱۹
۷۔ فریڈرک اینگلز، ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز''، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۸، ص ۳۲
۸۔ ایضاً، ص ۸۱
۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۲
۱۱۔ ایلن وڈز، ٹیڈ گرانٹ، ''مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس''، لاہور: طبقاتی جدوجہد پبلشرز، ۲۰۱۲، ص ۵۸۹
۱۲۔ الطاف جاوید، ''فلسفہ بیگانگی اور قرآن''، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۶، ص ۲۵
۱۳۔ سبط حسن، ''موسیٰ سے مارکس تک''، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵، ص ۱۷۳
۱۴۔ الطاف جاوید، ''فلسفہ بیگانگی اور قرآن'' ایضاً، ص ۳۰
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۳
۱۶۔ کارل مارکس، ''کیپٹل''، مترجم؛ سید محمد تقی، ''ایضاً، ص ۲۴۹
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۱
۱۸۔ الطاف جاوید، ''فلسفہ بیگانگی اور قرآن'' ایضاً، ص ۴۸،
۱۹۔ الطاف جاوید، فلسفۂ بیگانگی اور قرآن، ایضاً، ص ۵۱
۲۰۔ ایضاً، ص ۵۱
۲۱۔ کارل مارکس، بحوالہ ''فلسفہ بیگانگی اور قرآن''، ایضاً، ص ۵۲
۲۲۔ الطاف جاوید، فلسفۂ بیگانگی اور قرآن، ایضاً، ص ۵۶
۲۳۔ ایضاً، ۵۸
۲۴۔ ایضاً، ص ۵۹/۶۰
۲۵۔ .Http://en.wikipedia.org/wiki/social_alienation P 30 of 15

۲۶۔ الطاف جاوید، فلسفہ بیگانگی اور قرآن، ایضاً، ص ۶۹
۲۷۔ ایضاً، ص ۷۱
۲۸۔ ایضاً، ص ۷۶
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۶
۳۰۔ ایضاً، ص ۷۸
۳۱۔ الطاف جاوید، فلسفہ بیگانگی اور قرآن، ایضاً، ص ۱۰۶
۳۲۔ البرٹ جے بی ورج، مشمولہ بحوالہ فلسفۂ بیگانگی اور قرآن، ایضاً، ص ۱۱۰
۳۳۔ طاہرہ صدیقہ، ''دوسری جنگ عظیم کے اردو ادب پر اثرات''، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱، ص ۱۱-۱۲
۳۴۔ ایضاً، ص ۳۱-۳۴
۳۵۔ سبط حسن، ''موسیٰ سے مارکس تک''، ایضاً، ص ۲۹۴-۹۵
۳۶۔ روش ندیم، صلاح الدین درویش، ''تیسری دنیا کا فلسفہ انکار''، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۱، ص ۲۸
۳۷۔ ٹومی شیریڈن والین میک کومبز، ''سوشلزم اکیسویں صدی میں'' مترجم مجاہد لاہوری، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۵
۳۸۔ ایلن وڈز و ٹیڈ گرانٹ، ''مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس، ایضاً، ص ۵۸۹
۳۹۔ ایضاً، ص ۵۹۰
۴۰۔ ایضاً، ص ۵۹۰
۴۱۔ ایضاً، ص ۵۹۰
۴۲۔ ٹومی شیریڈن والین میک کومبز، ''سوشلزم اکیسویں صدی میں''، ایضاً، ص ۲۶
۴۳۔ ایضاً، ص ۲۶
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۷
۴۵۔ ایضاً، ص ۴۳
۴۶۔ سبط حسن، ''تعارف'' مشمولہ مارکس کا تصورِ بیگانگی، صفدر میر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵، ص ۸
۴۷۔ فریڈرک اینگلز، ایضاً، ص ۱۷۵